عرش صدّیقی کے نام اردو ایکاڈمی کی ایک نشست اور ایک شامِ ترنّم

از قلم کوثر سیّد

سر گوشیوں اور دبے دبے لہجے میں ہوتی گفتگو کے بیچ، کچھ قہقہوں کی مدھم سی گونج، محفل کے حسبِ معمول اخلاق و آداب کا اظہار تھے۔ سب کچھ حسبِ معمول تھا، مگر جب تک اسٹیج پر نظر نہ پڑے۔ بس یہ لمحہ تھا جو اس محفل کی انفرادیت کا مظہر تھا۔ اسٹیج پر جہاں ناظمین اور صدرِ محفل کی کرسیاں ہوا کرتی ہیں، وہاں اس روز ہارمونیم، تان پورا اور طبلوں کی سجاوٹ تھی اور اسٹیج سے نیچے ان حضرات کے لیے ٹیبل سجایا گیا تھا۔ یہ اردو اکیڈمی شمالی امریکہ کی منعقد کی جانے والی وہی ماہانہ محفل تھی جس کا چاہنے والے بیتابی سے انتظار کرتے ہیں۔

۱۹ اپریل ۲۰۱۵ کے دن کی پیشکش اپنے تمام اخلاص کے ساتھ شروع ہوئی، تاشی صاحب نے محفل میں شرکت کرنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوے نشست کا آغاز کیا، اور دونوں ادوار کے پروگرام سے سب کو آگاہ کیا۔ محترم عصمت کمال صاحب کو محفل کی صدارت کی دعوت دی گئی جسے قبولیت دے کر جناب عصمت کمال صاحب نے اس نشست کو سعادت بخشی۔

پہلے دور میں اردو ادب کے مشہور شاعر جناب عرش صدیقی اور ان کے فن کے متعلّق گفتگو ہوئی جس کی نظامت، محترمہ لبنیٰ منظر صاحبہ نے فرمائی اور کچھ افراد نے عرش صاحب کی شاعری بھی پڑھی۔ دوسرا دور موسیقی کے رنگوں سے سجا تھا۔ یہ دور نگیش اَوَدھانی صاحب کی نظامت کے زیرِ سایہ، ان کے مدعو کیئے گیئے مہمانوں کے ذریعہ ایک پُر ترنم پیشکش رہا جس میں کچھ راگوں کو سمجھایا گیا، پھر ان پر مبنی گیت و غزلیات گائے گیئے۔

عرش صدیقی

عرش صدیقی کی ولادت ۲۱ جنوری ۱۹۲۷ میں گُرداس پور پنجاب میں ہوئی۔ اُن کا اسمِ گرامی ارشاد الرّحمان رکھا گیا لیکن ادبی دنیا میں انہیں عرش صدّیقی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُن کے والدِ بزرگوار کا نام بشیر الرّحمان صدّیقی تھا۔

اردو کے علاوہ عرش صدیقی ہندی اور، انگریزی، کا بھی گہرا علم رکھتے اور ان زبانوں میں لکھے ادب کا ترجمہ اور تالیف بھی فرماتے۔ وہ ایمرسن کالج ملتان میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ وہ شاعر بھی تھے نقاد بھی، ترجمہ کار بھی اور نثار بھی، بے مثال افسانہ نگار اور محقق بھی۔ فنِ مقالہ نگاری اور انشائیوں پر بھی مہارت رکھتے۔ ان سب فنون کے مالک ہوتے ہوئے وہ ایک پر اثر استاد بھی تھے جو اپنے شاگردوں کی زندگی کے ہر پہلو میں رہبری کرتے اور خیال رکھتے کہ ان کے شاگرد فن کے ساتھ ساتھ کامیاب ہونا بھی سیکھیں۔

ویسے تو عرش صدیقی نے باقائدہ لکھنا ۱۹۵۰ سے شروع کیا تھا، مگر اس فن کی ابتدا ۱۹۴۱ سے ہو چکی تھی جب انہوں نے کتابیں پڑھنا شروع کیا۔ وہ خود فرماتے:

میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا تب مجھے چند ماہ کے لئے اپنے تایا کے پاس ان کے شہر بھوانی میں رہنے کا موقع ملا۔ ان کے گھر میں ایک بہت عمدہ لائبریری تھی۔ وہاں پہلی دلچسپ کتاب جو میرے ہاتھ لگی وہ طلسمِ ہوشربا کا ایک حصہ تھی۔ اس نے مجھے ایسا محصور کیا کہ میں نے اسے مکمّل پڑھ ڈالا۔ مزید افسانوں میں، آزاد، داستان امیر حمزہ، یونانی دیومالا، الف لیلیٰ، شاہ نامہ، فردوسی، وغیرہ تھے۔

اس دور میں عرش اکثر بچوں کی کہانیاں لکھتے، لیکن جو کچھ لکھتے وہ دوست احباب تک محدود رکھتے، جو پاکستان کی سمت ہجرت کے وقت غارت ہو گیا۔ پاکستان آنے کے بعد عرش نے معاش حاصل کرنے کے لئے ترجمہ نگاری کی۔ قندیل کے مُدیر شیر محمّد اختر ان کی تحریر شایع کرتے، حوصلہ بڑھاتے اور معاوضہ بھی دیتے۔ یہ دور ان کے ایم اے کرنے سے پہلے کا دور تھا۔ ان تراجم کے زیرِ اثر عرش کا فن ترقّی پانے لگا، اور کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ جانے کا سلیقہ انہیں آ گیا۔

عرش کی پہلی کہانی ' ایک جہاں سب سے الگ' ان کے بچپن کی جھلکیاں کچھ حد تک ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور کہانی ' کتّے' نقوش لاہور میں ۱۹۶۱ میں چھپی باقی ۸ ۱۹۶۱ سے ۱۹۷۸ تک شایع ہوتی رہیں۔ آخری کہانی ' باہر کفن کے پاؤں' تھی۔

وہ غزلیں بھی لکھتے مگر مشاعروں میں نظم سنانے کو ترجیح دیتے۔ غزل کی زبان کے سلسلے میں عرش صدیقی بیان اور اسلوب میں پیچیدگی کے عمل کو ناپسند فرماتے اور عبارت کی صفائی ، تخیّل اور جذبات کے علاوہ وِژن کی قوّت کو بڑی اہم مانتے۔ ان کا کہنا تھا کہ وِژن وہ قوّت ہے جس کے بغیر انسان نہ ماضی میں جھانک سکتا ہے نہ مستقبل میں دیکھ سکتا ہے، اور جو فرد ایسا نہیں کر سکتا اس کے علوم اور فنون میں کسی بھی اضافے کی گنجائش کی توقّع نہیں کی جاسکتی۔ غزل میں موسیقیت، قوافی کے انتخاب اور ردیف کے روانی سے استعمال کو بہت پسند کرتے۔ وہ فرماتے تھے کہ فن صرف لاشعور تک محدود نہیں ہے اسے شعور کے ساتھ نکھارا جاسکتا ہے۔ وہ تنقید کو ادب کا دشوار ترین شعبہ کہتے اور فرماتے کہ نقّاد کو چاہیے کہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے لیکن جذبات کے بجائے شعور کی کار فرمائی کے ساتھ۔

لاہور گورنمینٹ کالج سے عرش نے ایم اے کیا پھر امریکہ میں ورلڈ یونیورسٹی اری زونا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آگے چل کر ملتان کی بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی کے انگریزی ادارے میں چیئر مین رہے اور پھر رجسٹرار کی ذمہ داری بھی وہیں پر انجام دی۔ رائیٹرز گلڈ اور اردو اکادمی ملتان کے آغاز میں بھی کافی کار گر رہے۔

عرش صدّیقی کا انتقال ۱۸ اپریل ۱۹۹۷ کو ملتان میں ہوا۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں دیدہ یعقوب، محبت لفظ تھا میرا، ہر موج ہوا تیز (شاعری)، باہر کفن کے پانوں (افسانے)، تکوین محاکمات اور سائینسی شعور (تنقید) شامل ہیں۔ باہر کفن کے پانوں کے لئے انہیں آدم جی اوارڈ ملا تھا۔

عرش صدّیقی کے اشعار پڑھنے والے کچھ افراد یوں تھے:

۱) محترم تصدّق عطّاری صاحب	تابندہ حسن زارِ بہاراں ہمیں سے ہے نظر خزاں جو ہے تو حراساں ہمیں سے ہے
۲) محترم معیز خان صاحب	غم کی گرمی سے دل پگھلتے رہے تجربے آنسوؤں میں ڈھلتے رہے
۳) محترم ارشاد خان صاحب	اک تیری بے رخی سے زمانہ خفا ہوا اے سنگ دل تجھے بھی خبر ہے کہ کیا ہوا
۴) محترم حاتم رانی صاحب	بس ایک ہی کیفیتِ دل صبح و مسا ہے ہر لمحہ میری عمر کا زنجیر بپا ہے
۵) محترم ظفر نقوی صاحب	ہم اس لئے بن مے پیے بیٹھے ہیں ادب سے مستی میں کوئی بات نکل جائے نہ لب سے
۶) محترم مبین خلیل صاحب	دل خوں ہے دل کا حال رقم ہو تو کس طرح دل سے قلم کا فاصلہ کم ہو تو کس طرح
۷) محترم اظہر شاہ صاحب	دیدنی اب سفر زیست کا منظر ہو گا جس نے لوٹا سرِ بازار وہ رہبر ہو گا
۸) محترم خالد رانا صاحب	ہم کبھی چشم زمانہ سے نہ پنہاں ہوں گے ہم ہر اک دور میں ہر دل میں نمایاں ہوں گے
۹) محترم جعفر شاہ صاحب	میں عالمِ امکاں میں جسے ڈھونڈھ رہا ہوں وہ پوچھ رہا ہے کہ کسے ڈھونڈھ رہا ہوں
۱۰) محترم نگیش اودھانی صاحب	(باترنم) پھر اسی شہر کا فسانہ چھیڑ مطربہ طرز عاشقانہ چھیڑ

اس طرح پہلے دور کا اختتام ہوا اور کچھ وقت کے لئے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا گیا جس میں حسبِ معمول چاندنی ریسٹورنٹ کے مالک جناب سیّد ثروت صاحب کی طرف سے چائے اور ناشتے کا انتظام رہا۔ ناشتے کا دور پورا ہوتے ہوتے اسٹیج پر رکھے سازوں کے ساز گار محفل میں آچکے تھے اور جب تک سامعین اپنی اپنی نشستوں پر واپس ہوئے، ہال کی فزا میں تان پورا ہلکے ہلکے گونج رہا تھا۔ سب ساز کے بجانے والے اپنی جگہ آچکے تھے اور اپنے اپنے سازوں کو ضروری ڈھب سے تیّار کر رہے تھے۔

اس دور کی نظامت نگیش اَودھانی صاحب نے کی۔ ابتدا میں انہوں نے اس دور کی سرگرمیوں سے سب کو آگاہ کیا: راگ یمن، راگ بھوپالی، اور راگ کیدار اپر گفتگو ہو گی اور ان راگوں پر مبنی کچھ پکے راگ، نغمے اور غزلیات پیش کیے جائیں گے۔ یہ تینوں راگوں کو شام کے وقت گایا جاتا ہے اور یہ تینوں ٹھاٹ کلیان میں سے ہیں۔ اور پھر آنے والے فنکاروں کا سب سے تعرف کروایا۔

اس شام کی سروچی الوانی صاحبہ خاص فنکار تھیں۔ انہوں نے بچپن سے ہی سنگیت سیکھنا شروع کیا تھا جب ان کی والدہ نے اس فن سے انہیں آگاہ کیا۔ پھر کچھ وقت کے بعد پونے میں شری متی رنجنا کے زیرِ سایہ اس تعلیم کو آگے بڑھایا۔ سروچی صاحبہ بھارتی پکّے راگوں کے علاوہ سیمی کلاسیکل سنگیت سے تعلّق رکھتی ہیں اور اس سلسلے میں امریکہ اور ہندوستان میں کئی مقابلوں میں حصّہ لے چکی ہیں۔ پچھلے تین سالوں سے یہ بچوں اور بڑوں کو بے ایریا میں سنگیت کی تعلیم دے رہی ہیں۔ محترمہ آرتی پیش کر صاحبہ سروچی صاحبہ کی شاگرد ہیں وہ اس شام اپنی استاد کا ساتھ دے رہی تھیں۔ یہ بھی پونے سے ہیں۔ پونے میں شری متی جے شری کل کرنی کے زیرِ دست آرتی نے موسیقی سیکھنی شروع کی۔ نتن شاہ صاحب ویسے تو

سوفٹویر انجینیر ہیں انہوں نے شوقیہ طور پر استاد پنڈت اتّم چکر برتی اور پنڈت سوَپن چودھری کی شاگردی میں طبلہ سیکھا۔ پچھلے دو سالوں سے نتن شاہ گائیکی بھی سیکھ رہے ہیں اور محترمہ سروچی صاحبہ کی رہنمائی میں موسیقی سیکھ رہے ہیں۔ وہ اس شام سروچی صاحبہ کے ساتھ غزل اور نغمات کی پیشکش کر رہے تھے۔ ہارمونیم پر تھے جناب نرین درجوشی جنہوں نے بمبئی کے مشہور ہارمونیم نواشری ودیادھر اوک سے یہ فن سیکھا، اور صرف ہارمونیم پر کلاسیکی موسیقی پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سوفٹویر انجینیر ہیں۔ طبلے پر ایمان ہاشمی تھے جو جدید فنکاروں میں پسندیدہ موسیقار ہیں۔ اپنے والد جناب سے طبلہ بجانا سیکھا، جو پنجاب گھرانے کے مشہور استاد ہاشم صاحب کے شاگرد تھے۔ ۲۰۰۹ میں ایمان نے لکھنو گھرانے کے مشہور طبلہ نواز جناب سوَپن چودھری کی شاگردی اختیار کی، اور اپنے استاد کے ساتھ ۱۶ سال کی کم عمری میں اسٹیج پر دو مرتبہ سنگت کا شرف حاصل کیا۔ اپنے اس فن کے ذریعے ایمان افغانی لوک گیتوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کا دوسرا مقصد مغربی اور مشرقی موسیقی کو ملا کر موسیقی کو تابندگی دینا ہے۔

نشست میں پیش کیئے جانے والے راگوں کی وضاحت میں نگیش صاحب نے جو سمجھایا وہ کچھ یوں ہے:

کلاسیکل موسیقی مین ۷ سُر ہوتے ہیں جنہیں سپت سُر کہا جاتا ہے۔ سارے گاماپادھانی۔ ان کی جمع کو سپتک کہتے ہیں۔ ان سروں کے خاص نام بھی ہیں جیسے سا۔ کھرج یا شڈج، رے۔ رشبھ یا رکھب، گا۔ گمبھیر، ما۔ مدھیم، پا۔ پنچم، دھا۔ دھیوت، اور نی۔ نشاد یا نکھار۔ ان سات سروں میں رے، گا، ما، دھا، نی کی ۲ قسمیں ہیں۔ اب ان سروں کی تعداد جمع کی جائے تو ۷ اور ۵ ۱۲ سر بنتے ہیں۔

کسی بھی راگ کی پہچان جن چیزوں سے ہوتی ہے وہ ہیں:

ٹھاٹھ۔ یہ راگ کا انداز ہے۔ راگ میں سروں کو جس انداز سے گایا جاتا ہے وہ ٹھاٹھ پہ مبنی ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں ۱۰ ٹھاٹھ پائی جاتی ہے جس کے تحت دن کے کون سے وقت کون سا راگ گایا جانا مناسب ہے یہ طے کیا گیا ہے۔

آلاپ۔ موسیقی کا وہ پہلو ہے جو راگ کے آروہ، اوروہ، وادی، سموادی، اور پکڑ کو چھوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ فنکار اپنی آواز کو راگ کے دایرے میں پیچ و خم دیتا ہے۔ جب شعر کے بول آلاپ میں شامل ہوتے ہیں تو اُسے بول آلاپ کہا جاتا ہے اور اگر صرف آ آ کے استعمال سے گایا جاتا ہے تو اسے آکار کہا جاتا ہے۔

آروہ۔ وہ سُر جو اوپر کی سمت چلتے ہیں جیسے key board پر do سے ti تک، دائیں سے بائیں

اَوروہ۔ وہ سر جو آروہ کا اتار ہے جیسے key board پر ti سے لے کر واپس do تک بائیں سے دائیں

پکڑ۔ راگ کی پکڑ اس کی پہچان ہے جو اس کے سروں کی ادائیگی سے پتا چلتی ہے

وادی۔ یہ وہ سر ہے جو راگ میں بار بار گایا جائے اور جسے ذرا لمبا ادا کیا جائے جیسے قرَت میں کسی حرف کو مدیا اکھڑی زبر کے ساتھ پڑھا جائے

سموادی۔ یہ وہ سر ہے جو راگ میں سب سے کم گایا جائے

انووادی۔ یہ وادی اور سموادی کے علاوہ راگ میں استعمال شدا باقی سر ہیں

اس شام راگ یمن، راگ بھوپالی، اور راگ کیدار پر مبنی گیت اور غزلیات گائے گیئے۔ ان تینوں راگوں کو چننے کا سبب یہ تھا کہ یہ تینوں راگ ایک ہی ٹھاٹھ کلیان سے اٹھائے گیئے تھے اور انہیں گانے کا وقت رات کا شروعات کا پہر ہے اور محفل بھی کچھ شام کے لمحوں میں ڈھل رہی تھی۔

راگ یمن رومانی راگوں میں سے ایک راگ ہے جو ایران (Persia) سے سفر کرتا ہوا بھارت کے راگوں میں مقیم ہوا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ اس راگ کو بہت گاتے تھے۔ یہ راگ مودّت، عبادت، سکوت اور سنجیدگی کے اظہار کے لئے گایا جاتا ہے۔ اس میں سبھی سُروں کا استعمال ہوتا ہے اس لئے یہ ایک مکمّل راگ ہے۔ اس شام اس راگ کے تحت جو گیت گائے گےُ وہ یوں تھے:

آلاپ

کلاسیکی گیت۔ گاؤ گاؤ منگل گیت بدھائی

ترانہ

نغمہ۔ جیالے گیو جی مورا سانوریا

ہم ردیف غزلیں۔ عشق میں غیرتِ جذبات نے رونے نہ دیا (سدرشن فاخر) یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا (خواجہ حیدر علی آتش)

راگ بھوپالی بھی شام کے وقت کا راگ ہے خاص کر مغرب کے بعد، اور اسے عبادت، مودّت اور عقیدت کے اظہار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس راگ کے تحت کی گئی پیشکش یوں رہی:

آلاپ

کلاسیکی گیت۔ نندیا جاگی، جاگی موری ساس نندیا

ترانہ

غزل۔ بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی (بہادر شاہ ظفر)

نغمہ۔ ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں (اُمراؤ جان)

راگ کیدارا بھی ایک مکمل راگ ہے جس کا نام بھگوان شِو پر مبنی ہے۔ اس راگ کے تحت ٹھمری، خیال، دھرو پد، سیمی کلاسیکی نغمات اور غزلیات گائے جاتے ہیں۔ اسے رات کے دوسرے پہر میں گایا جاتا ہے۔ کیدارا پر سے کی گئی پیشکش یوں تھی:

آلاپ

کلاسیکی گیت۔ کانہا پرم نندن

ترانہ

غزل۔ کسی کی یاد میں دنیا کو ہیں بھلائے ہوئے (جہاں آرا)

نعت۔ بے کس پے کرم کیجیے سرکارِ مدینہ (مغلِ اعظم)

ٹھمری۔ راہ میں بچھی ہیں پلکیں آؤ (سرداری بیگم)

اس آخری پیشکش کے بعد نگیش صاحب نے سب کا شکریہ ادا کیا اور شام کا کچھ حصّہ طبلہ نواز ایمان ہاشمی کے ہنر کے مکمّل اظہار کے لئے مقرّر کر دیا۔ ایمان ہاشمی نے "سولو" طبلہ بجا کر اپنی ہنر مندی کا مظاہرا کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ جب فنکاروں کے کیف کا کچھ اثر کم ہوا تو تاشی ظہیر صاحب نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور نگیش صاحب اور تمام فنکاروں کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی ہندو پاک رشتے داری میں محبت اور اخلاص کی اہمیت بھی بیان فرمائی۔

تاشی صاحب نے کہا کہ آج سے سولا برس پہلے اردو اکیڈمی کی بنیاد اسی سوچ پر رکھی گئی تھی کہ اردو شاعری، بلکہ اردو ادب اور موسیقی ہم دونوں ممالک کے لوگوں کا مشترکہ اثاثہ ہے۔ چوں کہ دونوں ممالک کے افراد بڑی تعداد میں شامل تھے، اس لیے تاشی صاحب نے آج کے دن کو اپنے خوابوں کی تعبیر قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ محبت نفرتوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور با اثر ہوتی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ اردو اکیڈمی کی صورت میں محبت کا جو شجر لگایا گیا ہے، ہم سب لوگ مل کر اس کی آبیاری کریں گے اور آپس میں محبتوں کو فروغ دیں گے۔

اس طرح اردو اکاڈمی کی ایک اور شام تکمیل کو پہنچی اور لوگ سرشار ہو کر گھر کو چلے۔